عمرِ گریزاں

(غزلیں، نظمیں، ماہیے)

حیدر قریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

Umr e GurezaN

Poetry By: ***Haider Qureshi***

نام کتاب: **عمرِ گریزاں** (غزلیں، نظمیں، ماہیے)
شاعر: حیدر قریشی
اشاعت اول: ۱۹۹۶ء
تعداد: ۵۰۰
مطبع:
قیمت: ۱۰۰ روپے

انٹرنیٹ ایڈیشن
جنوری ۲۰۱۴ء

صرف یہ عمرِ گریزاں ہی نہیں کرتی اداس
میرا ہنستا ہوا بچپن بھی رُلاتا ہے مجھے

انتساب

شعیب، عثمان اور طارق کے نام

دریا کی روانی ہے
اب مِرے بیٹوں میں
مِری گزری جوانی ہے

اس میں مل جائے گا جا کر مِرے اندر کا خلا
اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد

ترتیب

غزلیں

نظمیں

کیا خبر کب سفر پہ چل نکلیں
اسپِ جاں پر ہمیشہ زِین رہے

یوں تو کتنے ہی ہم نشین رہے
کون دل میں سدا مکین رہے

نشۂ حُسن میں رہے تم بھی
ہم بھی کب عشق کے امین رہے

اپنے ہی دل کے آستانے پر
آستاں بوس اب جبین رہے

آسماں کی کوئی نہیں پروا
میرے پَیروں تلے زمین رہے

پاس رہ کر بھی پاس تھے میرے
دور ہو کر بھی وہ قرِین رہے

کیا خبر کب سفر پہ چل نکلیں
اسپِ جاں پر ہمیشہ زِین رہے

جیسے اب چاہے تُو سلوک کرے
آج سے ہم ترے رہین رہے

بس تو پھر طے ہوا یہی حیدرؔ
ہاتھ میں دنیا' دل میں دین رہے

☆☆☆

ہر چند ہم ایسے بھی جہاں تاب نہیں تھے
کب ماتھے پہ روشن کبھی مہتاب نہیں تھے

بے نام اُداسی تو ہمیشہ رہی لیکن
ہم اُس سے بچھڑ کر کبھی بے تاب نہیں تھے

یہ خواب بھی تیرے تھے اِنہیں ساتھ ہی لے جا
یہ بجھتے ہوئے خواب مِرے خواب نہیں تھے

کردارِ فقیہاں مِری آزادہ روی بھی
''گمراہی'' کے لیکن یہی اسباب نہیں تھے

اُس بزم میں ہر جھوٹ پہ بول اٹھتے تھے فوراً
نادان تھے ہم واقفِ آداب نہیں تھے

ہر گوہرِ نایاب کی تذلیل بجا ہے
پر ہم تو کوئی گوہرِ نایاب نہیں تھے

احباب کے تِیروں کے تو ہم عادی تھے حیدرؔ
اِس بار مگر بھائی تھے احباب نہیں تھے



درد جتنا بھی ترے در سے عطا ہوتا گیا
کاسۂ دل درد مندوں کا دعا ہوتا گیا

برہمی میں وہ نجانے کیا سے کیا کہتے رہے
بے خودی میں ہم سے جانے کیا سے کیا ہوتا گیا

جسم و جاں پر اک عجب مستی سی ہے چھائی ہوئی
اک نظر کے لُطف سے اتنا نشہ ہوتا گیا

پھر مِری شہ رگ سے بھی آتا گیا نزدیک تر
مجھ سے کیا بچھڑا ہے وہ گویا خدا ہوتا گیا

آنکھ میں، دل میں، لہو میں رقص فرمانے لگا
کس ادا کے ساتھ وہ مجھ سے جدا ہوتا گیا

گونج اُٹّھیں گنبدِ جاں میں مِری تنہائیاں
کوئی خط خاموش لفظوں سے صدا ہوتا گیا

پھول تھا وہ تو میں خوشبو بن کے اس میں جذب تھا
وہ بنا خوشبو تو میں بادِ صبا ہوتا گیا

جس قدر ہوتا گیا اُس کی محبت کا اسیر
ذات کے زندان سے حیدؔر رِہا ہوتا گیا

☆☆☆

کون دیکھے گا بھلا میرے خدا میرے بعد
رنگ لائے گی اگر میری دعا میرے بعد

رُوبرو میرے بنا بیٹھا تھا پتھر کی طرح
کسی چشمے کی طرح پھُوٹ بہا میرے بعد

عشق کے قصے سبھی مجھ پہ ہوئے آ کے تمام
کوئی مجنوں، کوئی رانجھا نہ ہوا میرے بعد

اس میں مل جائے گا جا کر مرے اندر کا خلا
اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد

جس نے دشمن کو مِرے قتل پہ اُکسایا ہے
لینا چاہے گا وہی خون بہا میرے بعد

ابھی ممکن ہی نہیں قرض چکانا تیرا
زندگی! قرض ترا ہوگا اَدا میرے بعد

روز طوفان اُٹھانے کی مشقت تھی اسے
دشت بے چارے کو آرام ملا میرے بعد

میرؔ و غالبؔ کی عطا اُن کی زمیں میں یہ غزل
حیدرؔ اوروں پہ بھی ہوگی یہ عطا میرے بعد



گرچہ ہمیں ہے پہلے بھی اک زک لگی ہوئی
لیکن گئی نہ یاس سے چشمک لگی ہوئی

ہر آن ہے گمان کہ شاید وہ آ گئے
دھڑکن ہے دل کی یا کوئی دستک لگی ہوئی

اپنا تمام حصہ اُنہیں دے کے آ گیا
آخر کو ختم کرنی تھی جھک جھک لگی ہوئی

تم اہلِ علم وفضل ہو لیکن کچھ اِس طرح
جیسے کوئی کتاب ہو دیمک لگی ہوئی

اُس کی محبتیں ہیں کسی اور کے لئے
تہمت ہمارے سر پہ ہے بے شک لگی ہوئی

پڑتا ہے یوں تو حُسن پہ اِس کا اثر مگر
اچھی لگی ہے آپ کو عینک لگی ہوئی

حیدؔر مذاق مت اِسے سمجھو یہ عشق ہے
بازی ہے اِس میں پاؤں سے سر تک لگی ہوئی

☆☆☆

درد اندر کے سب آنکھوں میں اُبھر آئے تھے
عشق میں جب ہمیں پانی کے سفر آئے تھے

شہر کی گلیوں نے چومے تھے قدم رو رو کر
جب ترے شہر سے یہ شہر بدر آئے تھے

آپ نے ہی درِ دل وا نہ کیا تھا ورنہ
صبح کے بھولے تو دوپہر کو گھر آئے تھے

یہ الگ بات کہ جی اُٹھے دوبارہ لیکن
ہم تری راہ میں تو جاں سے گزر آئے تھے

بازگشت اپنی ہی آواز کی بننا تھا ہمیں
ہم نے کب لَوٹ کے آنا تھا مگر آئے تھے

ایک سوہنی کی پذیرائی کی خاطر حیدرؔ
دل کے دریا میں کبھی کتنے بھنور آئے تھے



تجھ سے اب تیری شکایت نہیں ہونے والی
یعنی وہ پہلی سی چاہت نہیں ہونے والی

وہ تو از خود نہیں ہوسکتا ہے مائل بہ کرم
اور ہم سے بھی بغاوت نہیں ہونے والی

اس کی تعریف میں پُل باندھ لے چاہے جتنے
پھر بھی پوری تری نیّت نہیں ہونے والی

کاسہءِ عشق کو اب توڑ کے باہر پھینکو
ان بخیلوں سے سخاوت نہیں ہونے والی

اپنے حق میں تُو بھلے کتنی گواہی لائے
بے گناہی سے بریت نہیں ہونے والی

کعبہءِ دل کو کہاں چھوڑ چلے ہو حیدرؔ
تم تو کہتے تھے یہ ہجرت نہیں ہونے والی

☆☆☆

تمہاری شوخی، مِری خوش خیالیاں بھی گئیں
وہ وَلولے بھی گئے لاابالیاں بھی گئیں

کچھ ایسے ٹوٹ کے ملنا کہ ایک ہو جانا
محبتیں وہ ہماری نرالیاں بھی گئیں

جنہیں میں چاہتا تھا شادیاں کرا بیٹھیں
جو پیار کرتی تھیں وہ پیار والیاں بھی گئیں

نہ انتظار کا شوق اب نہ رَتجگوں کی بہار
وہ آرزوئیں وہ آنکھوں کی لالیاں بھی گئیں

یہ کیسی وقت کی آندھی بدن پہ آئی ہے
کہ پھول پتے تو کیا میری ڈالیاں بھی گئیں

قویٰ جو ڈھیلے پڑے اعتدال آنے لگا
جوانی ڈھلتے ہی بے اعتدالیاں بھی گئیں

بچی ہوئی تھیں جو دوچار خواہشیں حیدرؔ
لو آج دل سے ہمارے وہ سالیاں بھی گئیں

☆☆☆

دُھند یادوں میں جیسے بھٹکتے رہے
وہ بھی تکتے رہے، ہم بھی تکتے رہے

ممکنہ حد تلک شب سے اُلجھے تو ہیں
جگنوؤں کی طرح گو چمکتے رہے

پتھرّوں کا اُڑاتے ہوں جیسے مذاق
آئینے ٹوٹ کر یوں کھنکتے رہے

چند لمحے وہ اُن سے ملاقات کے
میری سانسوں میں برسوں مہکتے رہے

موت کی بھی حقیقت اُنہیں سے کھُلی
زندگی کے جو دل میں دھڑکتے رہے

☆☆☆

اُس ستم گر کے سب اندازِ ستم رہنے دے
دُشمنِ جاں کے سبھی جاہ و حشم رہنے دے

اے خدا! ڈر ہے مجھے طے ہی نہ ہو جائے کہیں
منزلِ عشق کو دو چار قدم رہنے دے

اُس سے کہہ دو کہ وہ اب یہ تو نہ چھینے مجھ سے
میرے دامن میں مِرے درد و اَلم رہنے دے

خاک عزت ہے یہاں اہلِ ادب کی حیدرؔ
چھوڑ یہ زورِ بیاں، زعمِ قلم رہنے دے

☆☆☆

یونہی دیکھا تھا جسے چشمِ تماشائی سے
اب نکلتا ہی نہیں رُوح کی گہرائی سے

اہلِ دنیا بھلا اِس رَمز کو کیسے سمجھیں
عشق رُسوا نہیں ہوتا کبھی رُسوائی سے

متن میں آپ کا ہی ذکر چلا آتا ہے
اچھا ہے بچ کے رہیں حاشیہ آرائی سے

آخری مرحلہ اِس کھیل کا رہتا ہے ابھی
خوش نہ ہو لشکرِ اعداء مِری پسپائی سے

جو رہِ اہلِ ملامت پہ چلا جاتا ہو
مت الجھنا کبھی ایسے کسی سودائی سے

جسم بھی اپنی جگہ زندہ حقیقت ہیں مگر
دل نہیں ملتے فقط جسموں کی یکجائی سے

مرحلے آئے تھے خوف اور گنہ کے پہلے
روشنی گیان کی پھر پھُوٹی تھی تنہائی سے

بے لحاظی کا کسے دُکھ نہیں ہوتا حیدؔر
ہم نے شکوہ نہ کیا پر کسی ہرجائی سے

☆☆☆

عشق میں اپنی ہی جب خاک اُڑالی ہم نے
پھر وہی خاک ترے پیار پہ ڈالی ہم نے

ڈھنگ کا کام کوئی ہم سے کبھی ہو نہ سکا
یوں تو سرسوں بھی ہتھیلی پہ جَما لی ہم نے

خود بھی پہچان نہیں پاتے ہیں اپنی صورت
جانے کس روگ میں یہ شکل بنا لی ہم نے

وہ بھی انکار کا عادی نہ رہا تھا بے شک
کب کوئی اس کی تمنّا کبھی ٹالی ہم نے

وہ سمجھ دار ہے مطلب تو سمجھ جائے گا
بات آدھی ہی کہی، آدھی چُھپالی ہم نے

کھیل رنگوں کا جو پھولوں سے سمجھ میں آیا
سیکھ لی خوشبو سے آوارہ خیالی ہم نے

جو دعا کرتے تھے اُلٹا ہی اثر ہوتا تھا
تیری چاہت کی دعا رب سے بچالی ہم نے

یونہی تُک بندی نہیں کی ہے غزل میں حیدرؔ
بھیڑ سے اپنی الگ راہ نکالی ہم نے

☆☆☆

میری دھرتی سے پرے، کوئی بلاتا ہے مجھے
کہکشاؤں کی عجب راہ دکھاتا ہے مجھے

چشمِ نَم کے وہ زمانے تو کبھی کے بیتے
لیکن اک تارا وہی قصے سناتا ہے مجھے

جس نے آمادہ کیا ترکِ تعلق کے لئے
اب وہی دل ہی کچوکے سے لگاتا ہے مجھے

ماں! ترے بعد سے سورج ہے سوا نیزے پر
بس تری ممتا کا اک سایہ بچاتا ہے مجھے

اِس زمانے کے خداؤں نے بگاڑا ہے مگر
میرے اندر کا اک انسان بناتا ہے مجھے

کس وفا سے وہ ابھی تک ہے ستم پر قائم
کس محبت سے ابھی تک وہ جَلاتا ہے مجھے

صرف یہ عمرِ گریزاں ہی نہیں کرتی اُداس
میرا ہنستا ہوا بچپن بھی رُلاتا ہے مجھے

جانے کیا بات ہے اُس شخص کے دل میں حیدرؔ
جو ابھی تک وہ بتا ہی نہیں پاتا ہے مجھے

☆☆☆

نہ کسی کے دَم، نہ عصا میں ہے
جو کمال تیری ادا میں ہے

اِسے کون ہے جو بُجھا سکے
یہ چراغ اپنی ہوا میں ہے

جو اثر ہے اُس کی نگاہ میں
نہ دوا میں ہے، نہ دعا میں ہے

جو مزہ ہے میرے سوال میں
کہاں اُس کے دستِ عطا میں ہے

مجھے ہر گنہ کی جزا ملی
وہ شرافتوں کی سزا میں ہے

نہ فلک پہ ہے نہ زمین پر
مِری رُوح جیسے خلا میں ہے

☆☆☆

جب سرکار کی جانب سے منظوری ہوتی ہے
فاصلہ کتنا بھی ہو عین حضوری ہوتی ہے

جذب کے عالم میں پہنچا بندہ جو کہہ جائے
بات خدائی ہوتی ہے سو پوری ہوتی ہے

باہر کے شیطان خرابی سی کر جاتے ہیں
ورنہ ہر انسان کی فطرت نوری ہوتی ہے

دل میں بسنے والے دُور بھلا کب ہوتے ہیں
دنیا کی نظروں میں بے شک دُوری ہوتی ہے

ویسے تو ہے عزت والا یہ منصب حیدرؔ
عشق میں لیکن ذلّت کی مزدوری ہوتی ہے

☆☆☆

(آپی کے لئے)

اتنی محبت ہے کہ گماں جیسی لگتی ہے
ماں جائی ہے لیکن ماں جیسی لگتی ہے

اُس کے ہونٹوں کی محراب دعاؤں والی
اُس کی خاموشی بھی اذاں جیسی لگتی ہے

دل میں ٹھہری ہوئی ہے میرے بچپن ہی سے
جس کی محبت آبِ رواں جیسی لگتی ہے

جس نے میرے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھا تھا
اپنے دل اور اپنی جاں جیسی لگتی ہے

بنی ہوئی ہے ڈھال وہ میری خاطر حیدرؔ
مِرے مخالف کو جو کماں جیسی لگتی ہے

☆☆☆

اُس نے میرے لئے عمر بھر دشتِ تنہائی کا جو سفر لکھ دیا
سارے صحرا میں تب چلتے چلتے مِرے ہر قدم نے شجر لکھ دیا

حال مستوں کی مستی کا عالم ہے یہ، آنے والے دنوں کو کہا
خواب بکھرا ہوا' اور رخشندہ ماضی کو ٹوٹا کھنڈر لکھ دیا

نام اُس کا چھپانے' بتانے کی مشکل سے یوں بچ سکے سر پھرے
انگلیوں سے ہواؤں پہ اُس کو کبھی تو کبھی آب پر لکھ دیا

میں نے اپنی دیانت کی سب دولتیں اپنی اولاد کو دیں فقط
اور باقی عزیزوں کو صرف اور صرف اپنے حصے کا گھر لکھ دیا

روٹھنے اور منانے کے سب سلسلے تو کجا آرزو ہی نہیں
خط میں اس کو تو بالکل ہی لکھنا نہیں چاہتا تھا مگر لکھ دیا

لوگ دستارِ حیدرؔ چھپانے، بچانے میں مشغول تھے جب تبھی
جانے دیوانگی تھی یا فرزانگی تھی مگر ہم نے سر لکھ دیا

☆☆☆

اس حُسن کے وہ جاہ، وہ اجلال کہاں ہیں
وہ پہلے سی آنکھیں، وہ خدو خال کہاں ہیں

وہ لہجے کی تاثیر، وہ آواز کا جادُو
ہونٹوں کے دہکتے ہوئے وہ لعل کہاں ہیں

عیار شکاری جہاں پھنس جاتے تھے آ کر
وہ زلف کے پھندے، وہ حَسیں جال کہاں ہیں

وہ زعمِ جوانی وہ ترے جسم کی خوشبو
فتنوں کو جگاتے وہ مہ و سال کہاں ہیں

ہر انگ میں اک حُسنِ تناسب تھا، کھنک تھی
اب تیرے دھنک رنگ پر و بال کہاں ہیں

وہ ہی تو فقط وقت کی زد میں نہیں حیدرؔ
خود تیرے بھی وہ پہلے سے احوال کہاں ہیں

☆☆☆

یہ دل کہ تجھ سے جو راز و نیاز رکھتا ہے
ترے حریف سے بھی ساز باز رکھتا ہے

قریشِ مکہ میں ہو یا مدینہ والوں میں
فقیر نسبتِ ارضِ حجاز رکھتا ہے

وہ پہلے دیتا ہے ترغیب پاس آنے کی
قریب آنے سے پھر خود ہی باز رکھتا ہے

ستم ظریف پہ غصہ بھی تو نہیں آتا
زباں کا تیز ہے پر دل گداز رکھتا ہے

نہیں تو صرف مِرے حال سے نہیں واقف
وہ بے خبر جو جہاں بھر کے راز رکھتا ہے

فرشتے کیسے کریں گے حساب پھر اس کا
ہر اک گناہ کا حیدرؔ جواز رکھتا ہے

☆☆☆

وہ سارے وار مقدر کے سہہ گئے ہوں گے
مگر حقیقتاً اندر سے ڈیہہ گئے ہوں گے

ستمگروں کی عنایات کی حکایت تھی
سو اہلِ دل کے بھرم کچھ تو رہ گئے ہوں گے

زمانے والوں کی باتوں پہ کان کیا دھرنا
زمانے والے تو کیا کچھ نہ کہہ گئے ہوں گے

وہ مسکرا تو دیا ہوگا سوچ کر مجھ کو
پر اُس کی آنکھ سے آنسو بھی بہہ گئے ہوں گے

لڑائی جھگڑا تو حیدرؔ نہ تھا مزاج ان کا
وہ گھونٹ زہر کے بس پی کے رہ گئے ہوں گے

☆☆☆

کب عقل کے بے ربط خیالات سے آئی
''بے راہروی'' عشق کی برکات سے آئی

اِس بار ہے مہینوال کسی اور نگر کا
سوہنی مگر اِس بار بھی گجرات سے آئی

سب کام بگڑ کر ہی سنورتے رہے اپنے
آسانی جب آئی ہے محالات سے آئی

یہ دل تو محبت ہی محبت تھا سدا سے
لہجے میں یہ تلخی مِرے حالات سے آئی

چالاکی کہاں آتی تھی حیدرؔ کو مِری جان
بس تیری اداؤں کی کرامات سے آئی

☆☆☆

سمندروں کی جگہ دشتِ بے کنار دیا
الٰہی! کشتیءِ جاں کو کہاں اتار دیا

ہمارے بس میں تو کچھ بھی نہیں خداوندا
ہمارے دل پہ بھی کب ہم کو اختیار دیا

پھر اس کو پانے میں کیا جیت کی خوشی ہوتی
کہ اس کو پانے میں جب اپنا آپ ہار دیا

ستم جو ہم پہ کیئے اُس نے بے حساب کیئے
کرم بھی کرنے پہ آیا تو بے شمار دیا

کوئی یہ کہہ دے مِرے دشمنوں سے اے حیدرؔ
مِرے خدا نے تمہارے خدا کو مار دیا ہے

☆☆☆

غموں سے اِس کو ہمیشہ نہال رکھتا ہے
ہمارے دل کا وہ کتنا خیال رکھتا ہے

نہ گلبدن ہے نہ چشمِ غزال رکھتا ہے
وہ سادگی میں ہی اپنا کمال رکھتا ہے

مِری جوانی کے ہیں ماہ و سال جس کے پاس
وہ بے وفا بھی زمانے کی چال رکھتا ہے

پھر اُس کے وصل میں کیا جانے کتنی لذت ہو
وہ جس کا ہجر بھی لطفِ وصال رکھتا ہے

تمام زخم اُسی نے عطا کیئے حیدرؔ
ہر ایک زخم کا جو اندمال رکھتا ہے

☆☆☆

محبتوں میں تم سے جو نباہ بھی نہ کر سکا
تمہارے بعد پھر کسی کی چاہ بھی نہ کر سکا

ہمارے نامۂ عمل میں کچھ بھی تو نہیں ملا
کہ بے نصیب دل اسے سیاہ بھی نہ کرسکا

کہاں وہ کر سکا ہے نیکیاں بھی کام کی کبھی
جو زندگی میں ڈھنگ کا گناہ بھی نہ کرسکا

کمالِ ضبط تھا اِدھر، کمالِ خامشی اُدھر
میں آہ بھی نہ کر سکا وہ واہ بھی نہ کر سکا

لگن مسافتوں کی حیدؔر اس قدر رہی کہ میں
ابھی تک اختیار کوئی راہ بھی نہ کر سکا

☆☆

وہ جو ہم کو آزمانے لگ گئے
زخم دل کے جگمگانے لگ گئے

صرف اپنے آپ تک آتے ہوئے
آپ کو کتنے زمانے لگ گئے

شہرِ جاں کی دیکھ کر یخ بستگی
خواہشیں تک ہم جلانے لگ گئے

رُوبرو قرآنِ حُسنِ یار کے
کیا حدیثِ دل سنانے لگ گئے

وادیٔ حیرت میں حیدؔر دیکھ لو
سارے فرزانے ٹھکانے لگ گئے

☆☆☆

آزادغزل

تماشہ بن گئے معتوب ہوتے جا رہے ہو
مگر پھر بھی اسی پتھر سے ہی منسوب ہوتے جا رہے ہو

تم اس میں جذب ہی کب ہو سکے ہو
تو پھر کیوں عشق میں مجذوب ہوتے جا رہے ہو

کوئی تو حد ہوا کرتی ہے آخر بے لحاظی کی
نرے غالبؔ کی غزلوں والے ہی محبوب ہوتے جا رہے ہو

ستم گاری و دلداری کی سب حدیں مٹا ڈالیں
بہت ہی خوب ہوتے جا رہے ہو

محبت میں بھی بزنس مائنڈڈ ہے وہ
یہ تم پاگل ہو جو جذبوں سے یوں مغلوب ہوتے جا رہے ہو

تصوف عشق میں لے آئے حیدرؔ
محبت کرتے ہو، محبوب ہوتے جا رہے ہو

خلا

کبھی تم دل میں بستے تھے
تو آنکھوں میں
کہیں اندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
بہاریں مسکراتیں،
کہکشائیں رقص کرتی تھیں
زمین و آسماں میں
ایسی یکتائی کا عالَم تھا
خلا کیسا؟

کہیں اک درز تک بھی تو نہیں
معلوم ہوتی تھی

مگر پھر یوں ہوا، اک دن
دھماکہ سا ہوا کوئی
زمین و آسماں میں اک دوئی
پیدا ہوئی
پھر فاصلہ در فاصلہ
اک سلسلہ بنتا گیا
اور اب یہ عالَم ہے
بہاریں کھو چکی ہیں
کہکشائیں بجھ گئی ہیں
اور مری آنکھوں میں
اک اندھا خلا ہے
دور تک پھیلا ہوا، جس میں
لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کو سجائے

چپ کھڑی ہے میری تنہائی،
اور اس کے گرد
اک سفّاک سناٹا
مسلسل
رقص کرتا ہے!

درد

گہرے سناٹے میں
دُور سے
کالے انجن کی سیٹی کی آواز آتی ہوئی
دل کو بھاتی ہوئی
اک لرزتی، سسکتی صدا

دُور ہوتے ہوئے
کسی تانگے کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز
تانگے کے پہیوں کی آواز سے مل کے
کوئی انوکھا سا جادو جگاتی ہوئی
دکھ کا احساس دیتے ہوئے

دُور ہوتے ہوئے
منظروں کی صدا

چوڑیوں کی چھنک
ٹوٹتی چوڑیوں کی چھنک
زخم خوردہ مگر مسکراتے ہوئے
گیت گاتی چھنک

بانسری کی دُکھی اور سُریلی صدا
سَرخوشی اور دُکھ کے رَچاؤ سے
دل میں کچھ ایسے اترتی ہوئی
جیسے الہام ہو

یہ ساری صدائیں مری آشنا ہیں
مجھے جانتی ہیں
میں اِن سب کو پہچانتا ہوں
متاعِ فقیراں۔۔۔۔۔۔۔

یہ سب میرے دردوں کی آواز ہیں
درد
جو میرے مونس ہیں
ماں جائے ہیں!

ایک اداس کہانی

یہ کیسی دُھند سی پھیلی ہے
میرے چارسُو
کچھ بھی نظر آتا نہیں
چاروں طرف مہکے ہوئے، پھیلے ہوئے
شادابیوں، زرخیزیوں کے
کتنے ہی منظر ہیں
لیکن دُھند نے سارے مناظر
اپنے دامن میں کچھ اِس ڈھب سے چھُپائے ہیں
مری نظریں کسی منظر کو بھی چھو ہی نہیں پاتیں
مگر کانوں میں سارے منظروں کی
مدھ بھری جھنکار پیہم گونجتی ہے
کوئی انجانی (یا شاید جانی پہچانی سی)
راحت بخشتی ہے

صدا جھنکار اور چہکار کی صورت
رگِ جاں تک اُترتی ہے، لہو میں بولتی ہے
روح میں رس گھول دیتی ہے
مگر دل میں نہیں آتی
کہ دل کے دیس میں آنے کے سارے راستے
آنکھوں سے آتے ہیں

یہ کیسی دُھند ہے جس نے مجھے تقسیم کر کے رکھ دیا ہے
مرا دل میری جاں کی
اور مری جاں، میرے دل کی جستجو میں ہے
مگر دونوں میں کوئی ربط ہو پایا نہیں جیسے

عجب سی دُھند پھیلی ہے
سبھی منظر صدا کے رُوپ میں ہی مجھ سے ملتے ہیں
یہ دلکش دُھند
دو قطروں کی صورت
جب سے اِن پلکوں پہ ٹھہری ہے!

پھاگن کی سفّاک ہوا

ہوا سفّاک لہروں کی طرح
یخ بستہ تیروں سے مسلسل حملہ آور ہے
میں اپنے بند کمرے میں مسہری پر
رضائی لے کے بیٹھا ہوں
مِری بیوی مِرے پہلو میں بیٹھی ہے
شعیب، عثمان، ٹیپو، مانو، رضوانہ
ہمارے سامنے
پہلو بہ پہلو دائرے کی شکل میں بیٹھے
ہماری مُورتیں ہم کو دکھاتے ہیں

ہمارا گمشدہ بچپن ہمارے سامنے
ان پانچ رنگوں میں چھلکتا ہے

ہوا سفاک لہروں کی طرح
یخ بستہ تیروں سے مسلسل حملہ آور ہے
کبھی تیروں کی اک بوچھار سی
جب بند دروازے پہ پڑتی ہے تو بچے
ایک لمحے کے لئے خوف اور حیرت سے
ہمارے منہ کو تکتے ہیں
اور اپنے آپ ہی پھر کھلکھلا کر ہنس بھی پڑتے ہیں

اگر اس وقت پھاگن کی ہوا سفّاک نہ ہوتی
تو میں اس بند کمرے میں
حَسیں بچپن کے ایسے جگمگاتے اور سہانے دن کہاں پاتا
جہاں گردی کے چکر میں
ہمیشہ کی طرح کھویا ہوا ہوتا
یہ پھاگن کی ہوا سفاک بھی ہے مہرباں بھی ہے!

تمہارے لئے ایک نظم !

تمہیں پانے کی خواہش صرف خواہش ہی نہیں جاناں
تمہارے اِن لب و رُخسار کی سُرخی پہ
میری شاعری کے سب دَمکتے رنگ بکھرے ہیں
طلسمِ حرف کے جو اِسم بھی ہیں
سب تمہاری آنکھ کے جادُو میں بستے ہیں
مِرے مفہوم اور معنی تمہاری رُوح میں پنہاں
تمہیں پانے کی خواہش صرف خواہش ہی نہیں جاناں !
مجھے اپنے ادھورے پن کی بھی تکمیل کرنی ہے

تمہارے بارے میں ہر سوچ پر میں نے
دعاؤں کے نہ جانے کتنے اندھے کرب جھیلے ہیں
بس اِس اُمید پر

یہ کرب اک دن روشنی بھی لے کے آئیں گے
تمہیں لیکن کوئی احساس تک بھی تو نہیں شاید !

چلو آؤ......مری آنکھوں میں تھوڑا جھانک کر دیکھو
کہ آنکھیں سچ ہی کہتی ہیں
تمہیں یہ خود بتائیں گی کہ میں نے تم کو پانے کی
دعائیں مانگنے کے جتنے اندھے کرب جھیلے ہیں
تمہاری ہی عطائیں ہیں
اور ان کی آنے والی روشنی بھی تو
تمہیں پانے کی حیرت زا بشارت سے عبارت ہے
سنو جاناں !
اب اپنے حُسن کے رنگوں سے میری شاعری بھر دو
اب اپنی آنکھ کے جادُو کے سارے اسم
مجھ پر کھول کر۔۔۔۔مجھ کو طلسمِ حرف کے اسرار سکھلاؤ
مِرے معنی، مِرے مفہوم بھی مجھ کو عطا کر دو
مِرے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دو۔۔۔۔نزدیک آ جاؤ !

چاند کی تسخیر کے بعد

لفظوں کو جستجو ہوئی اپنے وجود کی
مفہوم اپنے رشتے نئے ڈھونڈنے لگے
معنوں کی اک بساط بھی بچھنے لگی نئی
محبوب کے حوالے سے تفہیم چاند کی
اب صرف ایک قصہء پارینہ بن گئی
ایٹم کے دَور نے ہر اک شے کو بدل دیا
تہذیبِ نَو کے نام پہ قدریں بدل گئیں
حسِ لطیف مٹ گئی، انسان پٹ گئے
یہ دُور سے چمکتا ہوا چودھویں کا چاند
دراصل پتھروں کا اک ایسا طلسم ہے
جو اس کی چاندنی کے سرابوں میں تیر کر
پہنچے وہاں تو روح تک پتھرا کے رہ گئے
لیکن میں اپنے دور سے بالکل الگ تھلگ

اور اپنے نظریات کو بھی رکھ کے اک طرف
لفظوں کے وہ پرانے مفاہیم چوم کر
سوچوں تو تیرا چاند سا چہرہ دکھائی دے
میں ڈوب جاتا ہوں تری کرنوں کے نُور میں
تیری نگاہوں سے یوں اُمڈتی ہے چاندنی
لیکن میں جانتا ہوں کہ تُو صرف چاند ہے
وہ چاند جس کا دل ہے فقط پتھروں کا ڈھیر
ڈرتا ہوں تیرے قُرب سے پتھرا نہ جاؤں میں
میں چاہتا ہوں صرف تجھے سوچتا رہوں

جب جانتا ہوں دل ترا ہے پتھروں کا ڈھیر
پھر آئینہء روح کیوں ٹکراؤں گا بھلا؟
تسخیر کر کے میں تجھے کیا پاؤں گا بھلا؟
اچھا ہے تجھ کو دور سے ہی دیکھتا رہوں
اچھا ہے تجھ کو دور سے ہی سوچتا رہوں!

میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا

(زبیدہ کی رخصتی کے بعد)

تصور کے اُجلے دریچے سے میں نے
غمِ زندگی کا جو پردہ ہٹایا
تو یادوں کی سرسبز وادی میں
بیتے دنوں کی ہزاروں حسین اور رنگین گھڑیاں
محبت کے پھولوں کی صورت میں بکھری ہوئی تھیں
ہماری مقدس محبت کے رشتے
تناور درختوں کی صورت میں قائم کھڑے تھے

وہ بچپن، وہ کھیلیں............وہ جھگڑے، وہ چہلیں
وہ ہنسنا، ہنسانا............وہ رونا، رُلانا

وہ مل جل کے پڑھنا............وہ لڑ بھڑ کے کھانا
لڑکپن کے قصے............جوانی کی باتیں
وہ ہنستے ہوئے دن............وہ مسرور راتیں
اسی طرح کے کتنے ہی پھول اب بھی
ہماری محبت کی طرح جواں ہیں
مگر میں انہیں
پھولوں کے ساتھ کانٹوں
کو پا کر ٹھٹک سا گیا ہوں

جدائی کے کانٹے!
مجھے یاد ہے سب
کہ میں ہر جدائی کے موقعہ پہ ہی
آنسوؤں کا گلا گھونٹ دیتا رہا ہوں
جدائی کے دکھ
اصل میں اس حقیقت کا اظہار ہیں
کہ پھولوں سے کانٹوں کا جب تک تعلق رہے گا
سبھی بہنیں ہی اپنے بھائیوں سے یونہی

بچھڑتی رہیں گی

تصور کے اجلے دریچے کے پردے
ابھی تک ہٹے ہی ہوئے ہیں
مِری چاروں سمت اپنی بہنوں کی چاہت
کے پھولوں کی خوشبو بسی ہے
میں اب آنسوؤں کا گلا گھونٹنا بھی نہیں چاہتا
کیونکہ یادوں کی سرسبز وادی میں
بارش کا دلکش نظارہ بھی تو دیکھنا چاہتا ہوں
مگر اب بھی پھر اُس گھڑی
جب مری دوسری بہنیں بچھڑیں گی مجھ سے
میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا!

ایبٹ آباد

(دن کے وقت)

پہاڑوں کے دامن سے لپٹی ہوئی
یہ حسین اور سرسبز وادی کہ جیسے
کوئی خوبصورت سی، ننھی سی بچی
محبت کا اظہار کرتے ہوئے
ماں کے سینے سے چمٹی ہوئی،
جس کے چہرے کے نقش اور شادابیاں
آنے والی جوانی کی،
بے مثل حُسنِ مجسم کی
جھلکی دکھائیں!

(رات کے وقت)

یہ شہرِ نگاراں ہے یا کوئی
دوشیزہ سلمہ ستارے کے جوڑے میں
ملبوس شرمیلے پن سے کھڑی ہے
اگر اس کے تن پر
یہ سلمہ ستاروں کا جوڑا نہیں ہے
تو پھر اس کے اپنے بدن میں ہی
لاکھوں، کروڑوں ستارے فروزاں ہیں
آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہے ہیں

کبھی اس کی جادوگری دیکھ کر
ایسے لگتا ہے جیسے
فلک کے ستارے ہی یہ
جگمگاتا ہوا آسماں لے کے
اس وادیٔ دل نشیں میں اتر آئے ہیں

یا میں خود آسماں پر
کروڑوں ستاروں کے جھُرمٹ میں
چلتا ہوا جا رہا ہوں!

نصف سلور جوبلی

شبِ اوّل کی وہ محجوب سی
اک اوّلیں ساعت
تبسّم زیرِ لب
جب گنگناتی خامشی
اک گیت بن کر جسم میں اتری!

پھر اک مدھم ہنسی
مدہوش سرگوشی
مجسم گیت بن کر وہ چہکتا
گیت گاتا اک پرندہ
پھول اور کلیاں
خزاں ناآشنا کِھلتی بہاریں، زندگی!

زندگی
پھر زندگی کی رُوح سے لبریز چہکاریں
جو گاہے کھلکھلاتیں،
شور ہنگامہ بپا کرتیں
جو گاہے جھینپ بھی جاتیں
جواں، سرسبز جسموں کی مہک
شادابیاں
وہ روح کی پاتال تک سیرابیاں!

سرشاریاں
شاداب اور سیراب جسم و جان سے چھلکیں
تو آنگن میں بہاریں اور چہکاریں
دمک اٹھیں
ستارے، پھول، کلیاں
خوشبوئیں اور روشنی......روشن
شرارت، کھیل، جھگڑا اور
صلح و آشتی، پھر آشتی کے ساتھ ہی جھگڑا

کتابیں، کاپیاں، پنسل، قلم اور ہوم ورک
اتنے شرارت سے بھرے چہروں پہ ایسا نُور
یہ معصومیت، پاکیزگی
گنگناتے، کھنکھناتے، جگمگاتے قہقہے
زندگی ہی زندگی

بارہ برس اور چھ مہینے
آج پورے ہو گئے ہیں اپنی شادی کو!

صدا کا سمندر

فضا میں سمندر کی لہروں سی آواز ہے
سمندر کے ساحل سے اس وقت میں
سینکڑوں میل کے فاصلے پہ ہوں، پھر
یہ فضا میں سمندر کی لہروں کی موسیقی
کیوں نشر ہوتی چلی جا رہی ہے
انوکھی صدائیں امنڈتی چلی آ رہی ہیں
مِری رُوح پر چھا رہی ہیں

دسمبر کی یخ بستہ صبحوں میں
سورج نکلنے سے پہلے، فضا میں
پہاڑوں کے کوّوں کی ڈاریں اڑی جا رہی ہیں
انہیں کی صدائیں

سمندر کی لہروں کی میٹھی، سریلی صداؤں میں ڈھل کے
پہاڑوں کے دامن میں الہام بن کر اترتی چلی جاتی ہیں
اور میں اس فضا میں
صدا کے سمندر میں
پرواز کرتا ہوا تیرتا جا رہا ہوں!

منی پلانٹ

زمین سے جُڑا رہوں
تو تب بھی لہلہاؤں میں
زمیں سے کاٹ کر مجھے
بوتلوں میں پانی بھر کے ڈال دو
تب بھی میں ہرا رہوں
پَیر ہی جمانے کی مجھے کہیں جگہ ملے
میں جہاں بھی جا بسوں
وہیں ہرا بھرا رہوں
بلکہ میں جہاں رہوں
نصیب اُس کے جاگ اُٹھیں
میں کوئی خشک شاخ تو نہیں
کسی درخت کی!

فاصلوں میں ملاپ

ترے ہاتھوں کی مہندی اور تری نیندیں
مری آنکھوں کی سرخی اور میرے رَتجگے
بے شک ہمارے درمیاں جو فاصلے ہیں
اُن کے ہونے کی شہادت ہیں
ہمارے فاصلے پھیلیں یا سمٹیں
پر حدیں قائم ہی رکھتے ہیں
سمٹ کر بھی کبھی یہ قرب کی لذت نہیں دیتے
مگر ان فاصلوں کے درمیاں اک گھر بھی آتا ہے
مری آنکھوں کی سرخی
اور ترے نازک سے ہاتھوں پر سجی مہندی
تری نیندوں کی لذت
اور میرے رَتجگے
اِن فاصلوں کے درمیاں ملتے ہی رہتے ہیں!

محبت کا خدا

گئے موسم کے لَو دیتے ہوئے دُکھ
جب رَگِ جاں میں دہک اٹھیں
گھروندے خواہشوں کے، خواب کے مسمار ہو جائیں
اور اندھی روشنی کی دُھول رستہ بھی نہ دے
تب جان لینا تم
تمہارے واسطے دنیا میں اک میری محبت ہی
حقیقی روشنی ہے
اور باقی جھوٹ،
جھوٹی منزلیں اور تیرگی کے شہر ہیں
تب آزما کر دیکھ بھی لینا
خلوصِ دل سے جب مجھ کو
بلانے کا ارادہ ہی کرو گی
اپنی شہ رگ سے بھی تم نزدیک پاؤ گی مجھے!

حاصلِ زندگی

میری آنکھیں بھی کب میری آنکھیں ہوئیں
ندیوں کی طرح اس کا پانی کبھی
پتھروں سے الجھتا ہوا،
سر پٹختا ہوا
اور کبھی جیسے خاموش سی جھیل ہو
پھر کبھی ان میں دریاؤں جیسا سکوں
اور کبھی چودھویں رات میں
جیسے کوئی سمندر ہمکتا ہوا
میری آنکھوں کے اِن پانیوں سے
نکل کر کوئی جل پری
کوئی ننھی سی، پیاری سی گڑیا
مِری سمت آئی

تو میں اپنی ننھی ہتھیلی پہ
اُس کو اُٹھائے ہوئے
دوسرے ہاتھ سے اُس کو تھامے ہوئے
یونہی تکتا رہا
اس کے چہرے پہ معصومیت کی چمک
اور شرارت سے مہکا ہوا نُور تھا
میں اسے دیکھتے دیکھتے کھو گیا
(آج تک خود سے کھویا ہوا ہی تو ہوں)
اور پھر جانے کب
وہ مِری آنکھ کے پانیوں میں
کہیں چھپ گئی
تب میں اپنے کنارے پہ ہی،
اپنے جنگل میں ہی
جوگ لے کے یوں بیٹھا
کہ ہر پل میں صدیاں گذرتی گئیں
کتنی صدیوں کے بعد ایک دن

پھر مری آنکھ کے پانیوں سے اچھلتی ہوئی
اور چھینٹے اڑاتی ہوئی

وہ مرے پاس آئی
اس کے چہرے پہ معصومیت اور شرارت کا نور
اور بھی بڑھ گیا تھا، مگر میرا دل تو بجھا تھا
میں گہرے دکھوں اور اداسی کے سایوں میں
جوگی بنا یونہی بیٹھا رہا

تب بالآخر اُسی نے مجھے گدگداتے ہوئے
اپنے ننھے سے ہاتھوں سے تھاما تو ایسے لگا
میں جو صدیوں سے کھویا ہوا تھا
میں
خود کو پھر مل گیا ہوں
یہی خواب
بس اک یہی خواب ہے حاصلِ زندگی!

بہار کے پہلے دن

مِری آنکھوں کی برساتیں
جو شب بھر
تِیرگی سے بجلی کے کوندوں
کے ملنے اور بچھڑنے کا تسلسل دیکھ کر
اپنے سبھی دکھ بھول بیٹھی تھیں
تری مہکی ہوئی زلفوں کو
اور ہنستے ہوئے ہونٹوں کو
اس کی کیا خبر ہوگی
خزاں کی آخری ہچکی
بہار آنے کی پہلی چاپ سے ملنے لگی
تو میری آنکھوں کی گھٹاؤں نے

گواہی دی

مگر جب صبح دم

سورج نے اپنی نرم کرنوں سے

دھنک کے رنگ بکھرائے

تو آنکھوں پر کھلا جانم

خزاں کی آخری ہچکی

بہار آنے کی پہلی چاپ سے

جب تک نہیں ملتی

خزاں جا ہی نہیں سکتی، بہار آ ہی نہیں سکتی

میں اپنی آخری ہچکی پہ ہوں

اب جلد آ جاؤ!

عجیب دشمن

بہت پہلے

کبھی اس نے بڑے مدھم مگر شفاف لہجے میں

کہا تھا مجھ سے

میرے نائنٹی نائین پائنٹ نائین نائین پرسنٹ

سچے جذبے تیری چاہت کی امانت ہیں

محبت میں ریاضی کی یہ تک بندی مجھے ہرگز نہ بھائی تھی

میں چُپ تو ہو گیا لیکن

وہ اس کا پوائنٹ زیرو ون

جو اس نے میرے سو فیصد سے منفی کر کے

خود ہی رکھ لیا

میری نظر میں چبھ گیا، چبھتا گیا

وہ پائنٹ زیرو ون جذبہ

مِرا دشمن
میں اُس سے خوف کھاتا تھا

پھر اک دن یوں لگا
جیسے وہ پائنٹ زیرو ون بڑھنے لگا
اور بڑھتے بڑھتے خود مرے حصے کے
نائنٹی نائین پائنٹ نائین نائین
سچے جذبوں پر بھی حاوی ہو گیا

ہمارے برج
جدی اور جوزا بھی پھر اس کے دائرے میں آ گئے
جدی کی جوزا سے جو ازلی کشمکش ہے
یوں اُبھر آئی
محبت گم ہوئی
جھنجھلاہٹیں، جھلاہٹیں
طعنے، گلے، شکوے
کبھی خاموش لفظوں میں، کبھی کچھ تیز لہجے میں

ہم اب اک دوسرے کے سخت دشمن تھے
مِرا یہ حال تھا
میں اُس کی صورت دیکھنے کو بھی نہ راضی تھا
کچھ ایسا حال اُس کا تھا
اسی حالت میں کتنے دن
کئی صدیوں کی صورت ہم پہ بیتے تھے
پھر اک دن میں نے ہی جانا
کھرے سونے کی بھی اور
چینی میں Sucrose کی اپنی اوریجنل Purity بھی
نائنٹی نائن پائنٹ نائن نائن پرسنٹ ہے
تبھی مجھ پر ہوا یہ منکشف
کہ اُس کی چاہت تو کھرا سونا ہے
خالص، صاف اور شفاف چینی ہے
مِرے اُس سے سبھی شکوے، گلے جاتے رہے
وہ خود بھی راضی ہو گیا
جدی کی اور جوزا کی ازلی کشمکش بھی

حیرتوں میں کھو گئی
لیکن وہیں اگلے ہی لمحے
پھر بدل کر رہ گئے منظر
وہی جھنجھلاہٹیں، جھلاہٹیں
شکوے، گلے، طعنے
کبھی خاموش لفظوں میں، کبھی کچھ تیز لہجے میں
مگر میں دشمنی کے سخت لمحوں میں بھی
یہ سمجھا نہیں اب تک
وہ دشمن کون ہے
جو اُس کی گہری جھیل سی آنکھوں سے
ہر دم ہی مجھے اپنائیت،
لاانتہا اپنائیت کے ساتھ بس تکتا ہی رہتا ہے
جو مجھ سے پیار بھی کرتا ہے
اور دشمن بھی ہے میرا
عجب دشمن ہیں ہم دونوں!

یہ دل

کبھی یہ قرب کے لمحوں میں
فرقت کی سزا مانگے
کبھی یہ ہجر کے عالم میں
وصلِ جاوداں چاہے
کبھی یونہی اُداسی میں گھرا ہو
اور یونہی ہنس پڑے...... پھر
پاگلوں کی طرح بس ہنستا چلا جائے
ہنسے اتنا کہ میری آنکھ سے
آنسو ڈھلک آئیں
مِری آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی
آپ بھی بے ساختہ رونے لگے
روتا چلا جائے

میں ہنسنے اور رونے کا سبب
کیا جان پاؤں گا
تمہارے ہجر کی ساعت ہو چاہے وصل کا لمحہ
مگر یہ دل،
یہ پاگل دل، سمجھ میں ہی نہیں آئے
یہ دل ہے یا کوئی کردار اگلی داستانوں کا!

بے فیض موسم کا دکھ

اَسیرِ انا سے کوئی بھی
توقع عبث ہے
وہ صرف اپنی جھوٹی اَنا،
خود پسندی کا قائل
مگر میں کہ اپنی اَنا کا بھی منکر
مِرے عشق میں جسم سے رُوح تک جذب ہو کر
فنا میں بقا کی حقیقت کے مفہوم و معنی نہاں

خوشبوئیں
جذب ہو کے ہواؤں میں
اپنا سبھی کچھ
ہواؤں کو جب سونپ دیتی ہیں
پھیلی ہوئی وسعتوں میں

مہکتی فضاؤں کی صورت
''نہ ہونے'' میں ''ہونے'' کا عرفان کرتی ہیں
لیکن جو اپنی سبھی خوشبوئیں
اپنے اندر سمیٹے
خود اپنی ہی خوشبو میں سرشار ہے
جانتا ہی نہیں ہے
کہ خوشبو جو اندر رہی سمٹی رہے
تو پھر آخر وہ گہرے تعفّن میں ڈھل کر
دلوں کی معطر فضائیں بھی مسموم کرتی ہے

اب اس اسیرِ انا کو جب اس کی خبر بھی نہیں ہے
تو پھر اس سے حیدرؔ
کوئی بھی توقع عبث ہے!

ایک دراوڑ کا پیغام آریاؤں کے نام!

ہزاروں سال پہلے تم
ہوا کے تند جھونکوں کی طرح آئے
ہماری سرزمیں کو روندتے
تم نے گذرنا تھا
مگر تم تو بگولے بن گئے جیسے
جو باغوں، جنگلوں، کھیتوں کو
بس تاراج کرتے تھے
جو ہم پر راج کرتے تھے
تمہارے رقصِ جشنِ فتح میں
صدیوں تلک اڑتے رہے تھے
اصل باشندوں کی آزادی کے،

ان کی عزت و ناموس کے ٹکڑے
ہمیں محکوم کر کے تم رہے صدیوں تلک نازاں
یہاں پھر جو ہوا وہ سب الگ قصہ کہانی ہے

چلو چھوڑو اب اس قصے، کہانی کو،
نیا قصہ سنو!
اب میں دراوڑ
خود تمہاری سرزمیں پر آنے کو تیار بیٹھا ہوں
مگر اندھے بگولے کی طرح ہرگز نہیں
میں تو فقط بادِ صبا کے نرم جھونکے
کی طرح دھیرے سے آؤں گا
تمہارے گلشنوں کو تاخت و تاراج
کرنے کو نہیں،
میں ـــــ بلکہ ان کی
خوشبوؤں کو اپنے من میں
جذب کرنے کے لئے آؤں گا اور

اپنی محبت کے وسیلے سے مجھے
اب آریاؤں کے دلوں پر راج کرنا ہے
سنو، اے آریاؤ!
میں تمہارے پاس آنے کے لئے تیار بیٹھا ہوں!

ہوا

ہوا
یہ شُوکتی، پھنکارتی ناگن ہوا
برہم ہوئی
بل کھا کے جب پلٹی
تو آنچل سر سے ڈھلکا
زہر اس کا
کانچ کی ان چوڑیوں تک بھی
اتر آیا، جو پہنی ہی نہ تھیں

برہم ہوا ڈائن بنی

جب خواب جو دیکھے تھے
جن کا دیکھنا باقی تھا
سارے ٹوٹ کر بکھرے
سرابوں میں بھٹک کر رہ گئے
ڈائن ہوا تب اک بگولہ
بن کے سب کچھ لے گئی
ظالم ہوا ناگن بھی ہے
ڈائن بھی ہے
جو شُوکتے پھنکارتے
اندھے بگولوں سے
ہمارے یوسفوں کی زندگی کی
روشنی کو چاٹتی جائے

مگر ٹھہرو!
ذرا تم دل کے دریا میں
اُتر کر اپنی نَم آنکھوں سے

تھوڑا مسکراؤ اور پھر دیکھو
ہمارے رُوٹھنے والے
بھلا کب ہم سے بچھڑے ہیں
بچھڑتے ہی نہیں، اپنے جو ہیں
وہ تو فقط باہر کی دنیا سے
سفر کر کے
ہمارے دل کے بہتے پانیوں
میں آن بستے ہیں
بتائے ہی بِنا
جب ان کا جی چاہے
ہماری بے کلی کے منظروں کو
خود ہماری آنکھ کے اندر سے
تکتے ہیں
رُلاتے ہیں ہمیں اور آپ ہنستے ہیں
یا شاید خود بھی روتے ہیں!

ذرا پھر دل کے دریا میں اُتر کر
اپنی نَم آنکھوں سے تھوڑا مسکراؤ
اور پھر سوچو!
زمیں، پانی، فضاؤں تک
جہاں بھی زندگی ہے
اس ہوا کی حکمرانی ہے
ہوا نہ ہوا گر تو زندگی معدوم ہو جائے
نہ پھر یہ دل کے دریا ہوں کہ جن میں
روٹھنے والے
مسافت کو ادھورا چھوڑ کر
خود آن بستے ہیں
جہاں ان کی حسیں یادوں کے سب منظر مہکتے ہیں

ہوا ناگن سہی، ڈائن سہی، لیکن
ہوا تو زندگی بھی ہے!

دعا گزیدہ

سلامت رکھنا مولا!
سر پہ سایہ میرے ابوؒ کا۔۔۔۔۔۔دعا مانگی
کھلی آنکھیں تو میں دشتِ جدائی میں
سلگتی ریت پر تھا پابرہنہ سا

پھر امی جی کی لمبی عمر کی میں نے
دعائیں کیں
اک آندھی سی چلی اندھی جدائی کی
تو ماں بھی چھِن گئی مجھ سے

کھلے دشتِ جدائی میں سَوا نیزے پہ
سورج جیسی کوئی شے اُتر آئی
تو پھر سائے کی خواہش بھی
دعا کے روپ میں ڈھلنے سے

صاف انکار کر بیٹھی
اسے یہ خوف تھا سائے کے بدلے میں
کہیں سورج ہی سر پر ٹوٹ کر نہ گر پڑے

ہر اک خواہش دعا کے روپ میں
ڈھلنے سے خائف ہے
مگر مولا!
مجھے تجھ سے نہ کوئی بدگمانی ہے
نہ کوئی بے یقینی ہے
دعا کی استجابت کا یقیں بھی ہے
مگر مولا۔۔۔۔۔۔مجھے اپنے
سبھی باقی عزیزوں سے محبت ہے
ابھی میں ان کو کھو دینا نہیں ہوں چاہتا مولا!
سو ان کے واسطے کچھ بھی نہیں ہے مانگنا تجھ سے
معافی مانگتا ہوں اب فقط
پچھلی دعاؤں کی!

تیامت

(Tiamat (قدیم عراق) سمیری دیو مالا کی ایک سمندری بلا کا نام تھا)

یہ سنتے تھے
سمندر سے نکل کر
وہ کبھی اوپر چلی آتی
تو خشکی کے مکینوں کے لئے
ویرانیاں، بربادیاں لاتی
وہ مظہر تھی، ہلاکت اور تباہی کا
سبھی مجبور لوگوں پر ستم ڈھاتی
سبھی مقہور لوگوں سے کراتی
احترام اپنا، وہ جابر
قوت و طاقت پہ نازاں

نشۂ تقدیس میں
ڈوبی ہوئی، جب
جھومتی جاتی
ہلاکت اور بربادی کے منظر پھیلتے جاتے

یہ سنتے تھے، مگر اب دیکھتے بھی ہیں
کئی صدیوں تلک سوئی ہوئی، کھوئی ہوئی
جابر تیامت جاگ اٹھی ہے
ہلاکت خیز قوّت اور عظمت کے نشے میں جھومتی
قاہر تیامت ساحلِ مغرب سے نکلی ہے
سمیری سرزمیں کو اب کے اُس نے
صرف خشکی اور پانی ہی نہیں
ساری فضا سے، ہر طرف سے ہر جگہ سے
گھیر رکھا ہے!

ایک خواہش کی موت

وہ اک بھولی بھالی سی صحرائی خواہش
جو اِس دل کے صحرا میں بستی تھی
آنکھوں میں اُمید کی روشنی کے دیئے سے جلاتی
کبھی دل کے زَم زَم سے چھینٹے اُڑاتی
وہ میرے ہی چھینٹوں سے مجھ کو بھگو کر جو ہنستی
تو جیسے مرے دل کا صحرا
کھجوروں کے سرسبز میٹھے پھلوں والے
اونچے درختوں کی ٹھنڈک میں
ساری بہاریں سمیٹے ہوئے مسکراتا

مِرے دل کا صحرا کھجوروں کے سرسبز میٹھے پھلوں والے
اونچے درختوں کی ٹھنڈک میں ساری بہاریں
سمیٹے ہوئے مسکراتا تو دہکے ہوئے گرم سورج

کے سینے میں بھی پھول سے کھلنے لگتے

مگر ایک دن کیا ہوا
جانے کیسے ہوا
وہی بھولی بھالی سی صحرائی خواہش
مجھے چھوڑ کر چاند میں جا بسی
پتھروں کے نگر میں وہ جاتے ہوئے
میرے صحرائے دل کو بھی ہمراہ لیتی گئی
اس کے بدلے میں وہ مہرباں
میری آنکھوں کو کوئی سمندر عطا کر گئی
تب سے آنکھوں کو بخشا ہوا یہ سمندر
سدا چاند کی سمت
امنڈتا، چھلکتا
ہمکتا ہی رہتا ہے!

سرسوں کا کھیت

یہ بے اَنت میدان
میدان میں کیاریاں
ہر کیاری میں ہریالیوں کی قطاریں
یہ پودوں کی ہریالیاں اپنی ساری نمو
پیلے پھولوں کو دے کر
انہیں اپنے سر پر سجائے ہوئے جھومتی ہیں
یہ ہریالیاں، یہ خوشی اور مسرت کے پیکر
مگر پیلے پھول ان پہ دکھ کا نشاں ہیں
خوشی اور دُکھ کے ملن کا
انوکھا سماں ہے

یہ بے انت میدان
سرسوں کے سرسبز پودوں سے،
پودوں پہ پھولوں سے
غم اور خوشی سے اَٹا ہے
مرے دل کے نزدیک آؤ تو دیکھو یہ میدان کیا ہے!

تخلیق در تخلیق

خدا خلاّق ہے انسان کی تخلیق کرتا ہے
یہی انساں پھر اپنی جستجو میں خود نئی تخلیق کرتا ہے
یہی انسان لفظوں سے، سُروں سے اور رنگوں سے
کہیں نظموں، کہیں نغموں، کہیں پینٹنگز کو زنجیر کرتا ہے
یہ نظمیں، گیت، تصویریں کہ تخلیقات ہیں اس کی
مگر اس کی طرح یہ سب بھی اپنے اپنے جسموں کے گھروں میں
سانس لیتی ہیں، معانی کے کئی پرتوں کی صورت خود نئی تخلیق
کرتی ہیں، نئی تخلیق میں پھر اپنی ہی تفہیم کرتی ہیں
یہ ہر خلاّق کا، تخلیق کا، جیسے
خود اپنی کھوج، اپنی جستجو، تفہیم کا
تخلیق در تخلیق کا کوئی انوکھا سلسلہ سا ہے
اسی تخلیق در تخلیق ہی میں ارتقا کی داستاں جادو جگاتی ہے
’’کہانی ارتقا کی کیا فقط آگے کو ہی بڑھتی چلی جاتی ہے

یا بس اک دائرے میں گھومنا اس کا مقدر ہے؟‘‘
زمانہ سوچ میں غلطاں و پیچاں ہے!
مگر مجھ سے مری اک نظم سرگوشی میں کہتی تھی:
’’زمانہ جو بھی کہتا ہے، یقیناً اس کی ہر اک بات میں
اک جزوی سچائی بھی ہوتی ہے۔ کہانی ارتقا کی
آگے بھی بڑھتی ہے لیکن دائرے کی شکل میں
ایسے!‘‘

یہ کہہ کر نظم نے اس دائرے کو
ڈرائنگ کر کے ہی دکھایا تھا کہ اس میں سے
کوئی الہامی نغمہ سا اُبھر آیا!

ماہیے



بچپن کا زمانہ تھا
تتلی کے رنگوں
سے لکھا فسانہ تھا



چنبیلی کی کلیاں تھیں
اپنی جوانی تھی
اور شہر کی گلیاں تھیں



مستی ہے ہواؤں میں
رات کی رانی کی
خوشبو ہے فضاؤں میں



مرجھائے درختوں کو
دیں گی بہاریں کیا
ہم سوختہ بختوں کو



پت جھڑ کی ہوائیں تھیں
سہمے پرندوں کے
ہونٹوں پہ دعائیں تھیں



☆

چلنے کو ترستے ہیں
منزل گم ہے کہیں
بکھرے ہوئے رستے ہیں

☆

سورج ہو کہ خود تو ہو
رات کے سینے میں
کوئی تیر ترازو ہو

☆

حالات کے دھارے سے
آن لگے آخر
ہم اپنے کنارے سے

☆

چند رشتے

بیٹے

دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹوں میں
مری گذری جوانی ہے

بیٹیاں

مری چڑیوں کی جوڑی ہے
اک پہلوٹھی کی
اک پیٹ کھروڑی ہے

بیوی

اک رُوح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے

؟

سونے کی انگوٹھی ہے
پیار میں سچی ہے
پر قول کی جھوٹی ہے

خود

جسموں کی اُداسی ہے
جسم ہے آسُودہ
پَر رُوح تو پیاسی ہے



سوہنی ہے نہ ہیر ہے وہ
اس کی مثال کہاں
آپ اپنی نظیر ہے وہ



کچھ ہم نے ہی پی لی تھی
یا پھر سچ مچ ہی
وہ آنکھ نشیلی تھی



جوگی کے نہیں پھیرے
دل جہاں آ جائے
وہیں ڈال دیئے ڈیرے





دن وصل کے تھوڑے ہیں
جی بھر کر مل لو
پھر لمبے وچھوڑے ہیں



وہ نین غزالی تھے
فیصلہ کیا ہوتا
سب اس کے سوالی تھے



کچھ قید سنا دیتے
عشق کے مجرم کو
کوئی تو سزا دیتے





زخموں سے بھرا سینہ
عشق کی دنیا میں
جینا ہے یہی جینا



مسجد ہے نہ مندر ہے
دل یہ ہمارا تو
اک دکھ کا سمندر ہے



آنکھوں میں ستارے ہیں
ہجر کی شب میں بھی
وہ پاس ہمارے ہیں





کُونجوں کی قطاریں ہیں
درد سے کُرلائیں
یادوں کی جوڑاریں ہیں



دُکھ حق تھا غریبوں کا
تم سے گلہ کوئی
نہ ہی شکوہ نصیبوں کا



اس پیار کی زنجیریں
دل کا ہیں سرمایہ
یہ درد کی جاگیریں



مکالمے کی صورت میں

مرد: کتنے بدنام ہوئے
پیار میں تیرے ہم
پھر بھی ناکام ہوئے

عورت: ناکامی سے ڈرتے ہو
عشق بھی کرتے ہو
بدنامی سے ڈرتے ہو

مرد: اِس حال فقیری میں
عمریں بیت گئیں
زلفوں کی اسیری میں

عورت: زلفوں سے رہا ہو جا
رب تری خیر کرے
جا ہم سے جدا ہو جا

مرد: کیا لطف رہائی کا
دل جب سہہ نہ سکے
دُکھ تیری جدائی کا

مرد + عورت: ملنا ہو تو ملتے ہیں
پھول محبت کے
پت جھڑ میں بھی کھلتے ہیں

☆☆☆

☆

کیسی تحریریں ہیں
دشمن اپنے ہی
ہاتھوں کی لکیریں ہیں

☆

چُپ کا افسانہ تھا
دل یہ ہمارا تو
خاموش دوانہ تھا

☆

جاں وار گئے پیارے
جگ تمہیں جیت گیا
ہم ہار گئے پیارے

☆



ان ہونے کام ہوئے
سیتا کے ہاتھوں
پتھر بھی رام ہوئے



ہر بات انجانی ہے
پر یہ تمہارا دُکھ
میری ہی کہانی ہے



رُوٹھے کو منانا ہے
وقت جو بیت گیا
پھر واپس لانا ہے





کچھ من کی خرابی تھی
کچھ اس چہرے کی
رنگت بھی گلابی تھی



ماضی کی دشاؤں سے
کون بلاتا ہے
یادوں کی گپھاؤں سے



دوپہر جوانی تھی
پل میں بیت گئی
پھر شام سہانی تھی



☆

اظہار ضروری ہے

پیارا اگر ہو تو

اقرار ضروری ہے

☆

مل مہکی فضاؤں سے

یار نکل باہر

اندر کے خلاؤں سے

☆☆☆

فلیپ پر درج آراء

☆☆ معاصر شاعری میں تازہ کاری اور تازہ دمی کی ایک نمایاں مثال حیدر قریشی اور ان کا کلام ہے۔۔۔ غزل گوئی سے تو ان کی بنیادی دلچسپی ہے ہی (ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ " سلگتے خواب" شائع ہو چکا ہے) لیکن انہوں نے نظمیں بھی بہت اچھی کہی ہیں اور بعض نظموں کو پڑھ کر میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوا کہ وہ غزل کے زیادہ اچھے شاعر ہیں یا نظم کے۔۔ادھر انہوں نے اتنی بڑی تعداد میں ماہیے لکھے ہیں اور ماہیے کی صنف کی عروضی حیثیت پر مباحث میں اس طرح حصہ لیا ہے کہ اب ان کی شناخت ماہیے کے بغیر نامکمل ہے اور ماہیے کی شناخت ان کے بغیر۔

حیدر قریشی کے کلام سے ایک نرم دل جذباتی شخصیت ابھرتی ہے جس کے اندر محبت میں سب کچھ لٹانے اور بہت کچھ پانے کا جذبہ موجزن ہے۔۔۔۔۔حیدر قریشی کی شخصیت محبت کے جذبے کو کسی ایک فرد تک محدود نہیں رکھتی خواہ وہ محبوبہ ہی کیوں نہ ہو! وہ محبت کی ہمہ گیری کے قائل ہیں، جو ماں، بیوی، بہن، بھائی بلکہ ساری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔محبت کی یہی وسعت ان کی شخصیت کو توانائی عطا کرتی ہے اور کسی مخصوص مسلک یا عقیدے کے حصار میں مقید ہونے نہیں دیتی۔۔۔۔۔حیدر قریشی انسانوں سے ہی نہیں، بلکہ فطرت سے بھی اسی طرح ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔

مظہر امام (دہلی)

■■■■■■■■■■■■■

☆☆ حیدر قریشی اردو غزل کے نئے افق پر ایک سپوتنک کی طرح بلند ہونے والے ہمارے چند نوجوان شعراء میں شامل ہے۔حیدر کا شعر دردمند بھی ہوتا ہے اور خوش آہنگ و خوش رنگ بھی۔وہ اپنی تخلیقی فصل کے کسی خوشے، بالی، ٹانڈے کو دیمک نہیں لگنے دیتا۔اڑتا ہے تو زمین کو ساتھ لے کر اڑتا ہے۔ہماری جدید غزل میں ایسی اجلی اور پھر ایسی ''مٹیالی'' شاعری کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔میرے نزدیک حیدر قریشی شعراء کے اس عمدہ گروہ کے سرپنچوں میں سے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو جدید غزل کی وہ ساکھ نہ ہوتی، جو ہے۔

سید ضمیر جعفری (اسلام آباد)

■■■■■■■■■■■■■

☆☆ حیدر قریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہے۔ایک بار پڑھنا شروع کیا تو جی چاہا پڑھتی ہی رہوں۔دوسرا اہم وصف بے باکی اور وارفتگی کا ہے جو حیدر قریشی کی شاعری میں نمایاں ہے۔

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹرہیلڈ (ہائیڈل برگ)

■■■■■■■■■■■■■